محمد عامر سہیل

پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو و مشرقی زبانیں، جامعہ سرگودھا

پریم چند کے افسانوں میں ردِ استعماری رجحانات کا مطالعہ

Muhammad Aamir Sohail
PhD Scholar, Department of Urdu and Oriental Languages, UOS

A Study of De-Colonial Trends in Short Stories of Prem Chand

ABSTRACT
The most important literary figure of colonial era against the dominant imperialist designs was the Prem Chand. He knew all the traits of imperialism and had been trying to deconstruct them. He wished a system which is free from exploitation. Contemporary age occupies a paramount place in his novels. This contemporary age has linked with political and mental exploitations of colonial masters. He challenged, at every level, all the imperialist agendas and also those who were complicit. Extensive study of his novels reveals his rejection of imperialism, patriotism, non-cooperative policy, sodaishi movement, attempt of Hindu Muslim unity and revolutionary movement. His strong protest and resistant against suppressive colonial institutions, their corrosive impacts on society, colonial aristocratic and capitalists also show his de-colonial tendency. In this article those novels of Prem Chand are discussed which de-colonial trends.

Keywords: *Prem Chand, colonialism, patriotism, freedom, resistence, anti-imperialism, De-colonial, Conflict, Capitalism, De-construction.*

اُردو افسانے کا اولین مزاج ایک طرف حب الوطنی، قوم پرستی، ہندوستانی قومی یکجہتی اور وطن پرستی کا حامل ہے۔ دوسری جانب رد استعماری رجحانات کا پہلو بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ پریم چند کا بچپن دیہاتی ماحول میں گزرا، دورانِ تعلیم انھوں نے شہری زندگی کی مادیت پرستی کو قریب سے دیکھا۔ سماجی، معاشرتی، تاریخی، اصلاحی شعور کے ساتھ قومی، وطنی اور سیاسی شعور ان کی فکری پختگی کو ہمارے سامنے لاتا ہے۔ دیہاتی زندگی میں پریم چند نے نو آبادیاتی جاگیرداروں، زمینداروں، ساہوکاروں کا کسانوں اور مزارعوں سے استحصالی سلوک کا مشاہدہ کیا۔ شہری زندگی کی مادہ پرستی میں انھوں نے نو آبادیاتی سرمایہ داروں کے ہاتھوں مزدوروں کے ساتھ ہونے والی ناانصافی، ان کے

Article (1-1-3) Published on 28-12-2023
Tashkeel, Department of Urdu, University of Jhang, E mail: tashkeel@uoj.edu.pk
12KM, Chiniot Road, Jhang, Punjab, Pakistan. 047-7671240

جذبات اور استحصالی صورتوں کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ کولونیل اداروں پولیس، جیل، عدالت کی کاروائیوں اور کارکردگیوں کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہ کس طرح مقامی لوگوں کو کنٹرول کرنے کے لیے جابرانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ امن کے قیام کے جواز کے پیش نظر نو آبادیاتی اداروں نے کس طرح عوام کو قومی شعور سے دور رکھنے اور آپس میں الجھے رہنے کی طرف لگائے رکھا۔ عوام کو پولیس کے ڈر، جیل کے خوف اور عدالت کے چکروں نے ایسا الجھایا کہ وہ قومی شعور کے تحت استعمار مخالف جذبات سے عاری ہوتے گئے۔ پریم چند نے اس عہد کے ان معاملات، حالات و واقعات اور صورت احوال کا مشاہدہ کیا اور قریب سے دیکھا۔ وہ اپنے افسانوں میں استعماری حکومت، افسران اور نظام حکومت کے سیاسی، سماجی، معاشی، انتظامی اثرات کا ذکر کرتے ہوئے ان سے نفرت پیدا کرنے کے جو روش اختیار کرتے ہیں وہ ردِ استعماری رجحان کی متحمل ہے۔ افسانوں میں وطن، قوم، ملک اور ہندوستانیت سے محبت اور وفا کا درس بھی ردِ استعماری جہت ہے۔

پریم چند نے نو آبادیاتی جاگیر داروں کے استحصالی رویوں کو دکھایا، کس طرح وہ مظلوم کسان اور مزارعے کا حق مارتے ہیں۔ انھیں دبا کر رکھنے اور اتحاد سے دور کرنے کے لیے ان میں مزاحمتی جذبات کو کچلنے کے لیے کس طرح نو آبادیاتی ادارے پولیس، جیل اور عدالت ان جاگیر داروں کا ساتھ دیتی ہے۔ وہ نو آبادیاتی سرمایہ داروں کی نفسیات سے واقف ہیں جس طرح وہ ہر ممکن مزدوروں کا استحصال کرتے ہیں۔ یہ سرمایہ دار طبقہ انگریز معاونت میں شریک رہ کر مقامیوں سے زیادہ سے زیادہ معاشی مفاد حاصل کرتا ہے۔ اس کا کردار بھی استعماری نوعیت رکھتا ہے۔ نو آبادیاتی سرمایہ داریت نے شہروں میں جس اضطراب اور بے چینی کو جنم دیا، نتیجے میں مزاحمتی رویے پروان چڑھے جو ردِ استعماری رجحانات کے باب میں شمار کیے جاتے ہیں۔ پریم چند کے وہ افسانے جو حب الوطنی، وطن پرستی اور قومی شعور (ہندو مسلم اتحاد کی کوشش) کو اجاگر کرتے ہیں ان کی حیثیت بھی ردِ استعماری ہے۔ انھوں نے استعماری مظالم، استعماری افسران کا رویہ، ہندوستانی مقامی لوگوں میں استعمار اور استعماری افسران کے خلاف مزاحمتی جذبات، قومی شعور کے حامل مقامی لوگوں کا جذبہ حب الوطنی، نو آبادیاتی معاون اداروں کے استعماری کارکردگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ پریم چند کے افسانوں میں جو موضوعات ردِ استعماریت کو محیط ہیں ان میں حب الوطنی، وطن پرستی، قومیت پسند رجحان، ہندو مسلم اتحاد، نو آبادیاتی جاگیر داریت، سرمایہ داریت کے اثرات اور ان سے مزاحمت، نو آبادیاتی اداروں کے ہندوستانی معاشرے پر اثرات اور ان سے مزاحمت شامل ہیں۔

پریم چند کے افسانوں کا اولین ردِ استعماری رجحان 'حب الوطنی' ہے۔ انھوں نے اپنے پہلے افسانوی مجموعہ 'سوزِ وطن' (۱۹۰۸ء) میں حب الوطنی کو بطور خاص موضوع بنایا ہے۔ افسانوی مجموعے میں شامل پہلا افسانہ ''دُنیا کا سب سے انمول رتن' ہے۔ افسانے کا مرکزی خیال وطن کی محبت میں قربان ہونے والے سپاہی کا آخری قطرۂ خون دُنیا

کا سب سے انمول رتن ہے۔ اشک ندامت اور خاکِ وفا انمول رتن نہیں بلکہ وطن، ملک اور قوم کی خدمت، ان کے مفاد کے لیے جدوجہد، غیر ملکی استبداری جبری نظام حکومت سے نجات پانے کے لیے جہاد اور اس میں لڑنے والے سپاہی کا قطرۂ خون جو ملک و قوم کے لیے اپنی ہی دھرتی پر گرے وہ بیش بہا قیمتی چیز ہے۔ دُنیا کے انمول رتن کے متلاشی شخص کو استعماری حکومت سے لڑنے والا ملک و قوم کا بیٹا سپاہی کہتا ہے:

> "ہمارے باپ دادا کا دیس آج ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ اور اس وقت ہم بے وطن ہیں۔۔۔ کیا میں اپنے ہی وطن میں غلامی کرنے کے لیے زندہ ہوں! نہیں ایسی زندگی سے مرنا اچھا۔ اس سے بہتر موت ممکن نہیں۔" (1)

برصغیر کے مقامی لوگوں کا مزاج مطلق العنان بادشاہت کے زیرِ حکم رہنا تھا۔ مگر اس میں رعایا کے ساتھ برتاؤ ہمدردانہ اور خیر خواہانہ تھا۔ بادشاہ اور رعایا کے درمیان تعلق حاکم و محکوم کا تھا۔ نو آبادیاتی اداروں نے انھیں جبر اور تشدد میں جکڑ لیا۔ نو آبادیاتی حکمرانوں کے ساتھ ان کا تعلق حاکم اور محکوم سے زیادہ غالب اور مغلوب؛ استعمار اور استعمار زدہ کا تھا۔ اب ان میں تعلق مادیت کی زد میں آ گیا اور استعمار زدہ مسلسل استحصال زدہ ہونے لگا۔ مقامی (سپاہی) کو یوں محسوس ہوا کہ ان کا دیس جہاں وہ اپنی مرضی سے جیتے اور مرضی سے کام کرتے تھے، زندگی مادیت پرستی نہ تھی، چوں کہ زندگی مادیت پرستی کی حامل نہ تھی اس لیے معاملات زندگی اس قدر پیچیدہ نہ تھے۔ ضروریات زندگی مقامی چیزوں سے پوری ہو جاتی تھیں۔ لیکن اب ایسا نہیں انھیں نو آبادیاتی حکمرانوں نے بے فکری کی زندگی سے بے دخل کر کے مسلسل اذیت میں ڈال دیا ہے۔ غیر ملکی تجارت اور تسلط نے مقامیوں سے مقامی صنعت چھینی اور ان سے حکومت ہتھیا کر غیر ملکی مصنوعات یہاں فروخت کرنا شروع کیں۔ دیہاتی جاگیرداروں اور شہری سرمایہ داروں کے استحصال زدہ بنے تو انھیں احساسِ غلامی ہوا۔ یہ احساس انھیں اپنی ہی سرزمین پر 'غیر' محسوس کرواتا ہے۔ 'غیر کا تصور' جدید نو آبادیاتی مطالعات میں زیر بحث رہتا ہے۔ استعمار کار اور استعمار زدہ کا رشتہ جس قدر واضح، عیاں اور ظاہری نظر آتا ہے اس قدر پیچیدہ اور تہہ در تہہ ہوتا ہے۔ استعمار کی حیثیت غالب، حاکم، آقا اور مہذب کی ہوتی ہے جبکہ مقامی لوگ مغلوب، فرمانبردار غلام اور غیر مہذب تصور کیے جاتے ہیں۔ جوں کہ یہ تصور کیے جاتے ہیں اس لیے بات کی صداقت یقینی نہیں۔ وہ استعمار کی نظر میں 'غیر' ہوتے ہیں۔

نو آبادیاتی ملکوں میں مقامی باشندے کا استعمار سے ایک طرف اجنبیت اور فاصلے کا شکار تو دوسری جانب اپنے ہی وطن میں مغلوب ہو کر بے وطن محسوس کرنا، اس کے اندر استعمار مخالف جذبات پیدا کرتا ہے۔ مقامی کا خود کو بے وطن محسوس کرنا اسے حب الوطنی کے جذبات سے سرشار کرتا ہے۔ جس قدر استعماریت پر تشدد ہوتی ہے اسی قدر حب الوطنی کا جذبہ شدت اختیار کرتا ہے۔ مقامی غلامی کی زندگی نہیں گزارنا چاہتا، یہ زندگی اس پر مسلط کی جاتی

ہے، چوں کہ یہ مسلط کی ہوتی ہے اس لیے وہ اس کے خلاف احتجاج، بغاوت اور مزاحمت کرتا ہے۔ مقامی غلامانہ زندگی کو ٹھکراتا ہے اور سچے حب الوطن ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ 'دُنیا کا سب سے انمول رتن' میں سپاہی کا اپنی حاشیائی حیثیت قبول کرنے سے انکار اور وطن کی حفاظت، آزادی اور محبت کے لیے آخری خون کا قطرہ تک بہا دینے کا بے لوث جذبہ ردِ استعماریت ہے۔ حاشیہ ہمیشہ مرکز کے لیے ''غیر'' ہوتا ہے۔ پریم چند حب الوطنی کا جذبہ، وطن پرستی اور جان تک کو وطن، ملک اور قوم پر نچھاور کرنے کا درس دیتے ہیں۔ افسانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اشکِ ندامت اور خاکِ وفا کی حیثیت ثانوی جبکہ وطنی محبت میں قربان ہونے والے ایک قطرۂ خون کی حیثیت، قدر اور وقعت دنیا کی سب سے زیادہ قیمتی چیز سے کم نہیں ہے۔ یہ افسانہ استعماری نظام سے آزادی حاصل کرنے کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ پریم چند نے اس افسانے میں

"اعترافِ شکست، غلامی، حب الوطنی اور جاں نثاری کے ان سب پہلوؤں کا اظہار کر دیا ہے جس سے نئے قومی ضمیر کا شعور تیار ہو رہا تھا اور شکست خوردہ ذہن ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ، آزادی کے بعد بھی عسکری تصادم کے خواب دیکھ رہا تھا۔"(2)

ان کا افسانہ 'شیخ مخمور' جس میں انھوں نے قومی اتحاد کو ملک شیر آفگن کی مخالفت میں دکھایا ہے۔ افسانے میں مقامی عوام، ہندوستان میں ملکہ برطانیہ کے متبادل مقامی حکمران ''مسعود' کو تخت نشین کرتے ہیں۔ تاج مسعود کے زیب سر ہوا تو درباری جس جوش کا مظاہرہ کرتے ہیں، اس امر پر دال ہے کہ وہ مقامی حکمرانوں کو غیر ملکی تسلط کے مقابلے میں لانے کی متمنی ہیں۔ مقامی حکمران سے محبت کا اظہار وطن ملک اور قوم سے وفاداری اور غیر ملکی غلبے کے خلاف قومی اتحاد ہے۔ نوآبادیاتی عہد کا قومی اتحاد و قومی یکجہتی ردِ استعماریت کی راہ ہموار کرتا ہے۔ پریم چند استعماری جبری نظام کے مخالف جو بیانیہ پیش کرتے ہیں وہ صرف وطن پرستی اور حب الوطنی تک محدود نہیں بلکہ وہ برطانوی حکومت، استعماری حکمرانوں اور نوآبادیاتی نظام سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ہندوستان کی حیثیت نوآبادی (Colony) کی نہیں بلکہ خود مختار آزاد ملک کی دیکھنا چاہتے ہیں۔ افسانہ 'شیخ مخمور' میں قومی اتحاد اور مقامی حکومت کو جس انداز سے سامنے لایا گیا ہے یہ رویہ ردِ استعماریت پسند ہے۔ مقامی حکمران کا اعلان اس کی ماں نے ان الفاظ میں کیا:

"صاحبو! یہی میرا مسعود اور شاہ بامراد کا لختِ جگر ہے۔ تم لوگ اس کی رعایہ ہو۔ یہ تاج اس کا ہے۔ یہ ملک اس کا ہے اور ساری خلقت اس کی ہے۔ آج سے وہ اپنے ملک کا بادشاہ ہے اور اپنی قوم کا خادم۔" (3)

نظام کی تبدیلی کی خواہشیں افسانے سے ظاہر ہوتی ہے۔ عوام میں مقامی حکمران کے ساتھ محبت اور غیر ملکی سے اجنبیت کا احساس نظر آتا ہے۔ اجنبی حکومت اپنے ساتھ تہذیب لائی، مادی ترقی ہوئی ملک میں تبدیلی آئی اور

مقامیت کی جگہ آفاقیت اور ساتھ مشرق و مغرب کا اتصال ہوا۔ اس تبدیل کا احساس افسانہ 'یہی میرا وطن ہے' میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس میں اسّی سالہ بزرگ ساٹھ سال اور بعد امریکہ سے واپس اپنے دیس، وطن بھارت آتا ہے۔ اس کا دل حب الوطنی سے سرشار ہے۔ گو اس نے طویل عرصہ امریکہ میں گزارا مگر وہ اپنے وطن کی خاک میں ہی پیوند ہونا چاہتا ہے۔ امریکہ میں وہ خود کو 'غیر' محسوس کرتا ہے۔ اجنبی سرزمین سے اپنائیت کا احساس نہیں پیدا ہو سکتا۔ وہ بھارت کو اپنا دیس تصور کرتا ہے۔ اپنے دیس پہنچ کر وہ دیکھتا ہے تو اسے پورا نقشہ ہی بدلا نظر آتا ہے۔ ممبئی اتر کر استعماری تہذیب اثرات، مظاہر اور نقوش دیکھ کر ایک بار پھر اجنبیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ پھر اپنا گاؤں دیکھ کر اسے لگتا ہے، یہی اس کا دیس ہے وہ جہاں رہتا تھا مگر گاؤں کی زندگی بھی مغربی اثرات کے زیر آچکی تھی۔ وہ تہذیبی اثرات اور جن تبدیلیوں کا ذکر ہے وہ استعماری حکومت کی عطا ہیں۔ وہ ان تبدیلیوں سے دلچسپی ظاہر نہیں کرتا بلکہ اُس زندگی کی آرزو کرتا ہے جو اس سے قبل تھی۔ وہ بالآخر وہ گنگا کے کنارے چھوٹی جھونپڑی میں تقسیم ہو کر وطن میں مرنے کی خواہش کرتا ہے۔

ممبئی اتر کر جہاز، انگریزی لباس، انگریزی زبان بولتے ملاح، انگریزی دکانیں، موٹر کاریں، ربڑ والے پہیے، ریل اسٹیشن دیکھ کر وہ پکار اٹھتا ہے:

"یہ میرا پیارا دیس نہ تھا۔ یہ وہ دیس نہ تھا جس کے دیدار کی آرزو ہمیشہ میرے دل میں موجیں مارا کرتی تھی۔ یہ کوئی اور دیس تھا۔ یہ امریکہ تھا۔ انگلستان تھا۔ مگر پیارا بھارت نہیں۔"(4)

یہ افسانہ مغرب کی مادہ پرست، جدید، ترقی یافتہ تہذیب اور اس کے ہندوستان پر اثرات کو ظاہر کر کے اس کردار کو سامنے لاتا ہے جو اس سب کو ٹھکرا کر مشرق / وطن کی سرزمین، تہذیب، طرزِ معاشرت اور روحانیت کو پسند کرتا ہے۔ بزرگ کردار مغرب کے طرزِ حیات کو چھوڑ کر مشرقی زندگی کے اس طرزِ اسلوب کو اپناتا ہے جہاں دولت، مادیت، ٹیکنالوجی، عالی شان محلات نہیں بلکہ ایک سادہ جھونپڑی ہے۔ یہ جگہ اس کے لیے آرام و سکون کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ افسانے کے کردار کا امریکہ چھوڑنا، دولت، جاہ و حشمت ترک کر کے ہندوستان آنا، مقامیت کا احساس ہونا، مقامی گیت سن کر روحانی و قلبی سکون پانا، مغربی لباس اتار پھینک کر گنگا کی گود میں گر پڑنا دراصل مادیت پسند دُنیا، جدید مغربی تہذیبی یلغار اور استعماری ترقی سے انحراف ہے۔ افسانے کا راوی گنگا کے کنارے کی منظر کشی کے بعد اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:

"ہاں۔ ہاں یہی میرا دیس ہے۔ یہی میرا وطن پیارا وطن ہے۔ یہی میرا بھارت ہے۔ اور اس کے دیدار کی۔ اسی کے خاک میں پیوند ہونے کی حسرت میرے دل میں تھی۔"(5)

حب الوطنی کا یہ جذبہ پریم چند کے افسانوں میں ہندو مسلم اتحاد اور آزادی پسند تحریکوں کی صورت میں پختہ ہو کر ظاہر ہوا۔ افسانہ 'لاک ڈاٹ' میں ایک گاؤں کے دو اُن صاحبِ ثروت لوگوں کا تذکرہ ہے جن میں تین نسلوں میں عداوت کا سلسلہ چلا آرہا ہے۔ جو کھو بھگت اور بیچن چودھری گاؤں کے کسی مسئلے میں متحد نہ ہوتے بلکہ دشمنی کا یہ عالم تھا کہ ہر سطح پر دوسرے کے مخالف رہتے۔ گاؤں میں جب کسان سبھا کا آغاز ہوا تو چودھری اس میں شریک ہو گیا اور بھگت اس کی مخالفت پر اتر آیا۔ کسان سبھا کا تعلق سوراجیہ سے تھا اور سوراجیہ 'تحریک آزادی' کی جدوجہد تھی۔ انگریزی استعماری نظام سے آزادی حاصل کرنے کے لیے جتنی تحریکیں کسانوں، مزدوروں، مذہبی اور سیاسی حوالوں سے سامنے آئیں سب 'سوراجیہ' یعنی آزادی کی متمنی تھیں۔ ایک دن چودھری جنتا(عوام) میں کہتا ہے:

"ترو، سوراجیہ کا ارتھ ہے اپنا راج، اپنے دیش میں اپنا راج وہ اچھا ہے کہ کسی دوسرے کا راج ہو وہ؟"(6)

استعماری نظام نے برصغیر کی معیشت کو خاصا کمزور کر دیا۔ مقامی صنعت تباہ ہو گئی۔ مقامی صارفی حیثیت تک محدود رہ گیا۔ دیس میں بدیشی اشیا فروخت ہونے لگیں۔ دولت برصغیر سے مغرب(برطانوی تاجروں کے ہاتھوں) کی طرح جانے لگی۔ مقامی لوگ کسم پرستی کا شکار ہو گئے۔ اس صورتِ حال میں چودھری نے صاحب کہتے ہیں:

"ہمارے دادا بابا، چھوٹے بڑے سب گڑھا گجی پہنتے تھے۔ ہماری دادیاں، نانیاں چرخا کاتا کرتی تھیں۔ سب دھن دیش میں رہتا تھا۔ ہمارے جُلائے بھائی چین کی بنسی بجاتے تھے۔ اب ہم ودیش کے بنے ہوئے ہیں رنگین کپڑوں پر جان دیتے ہیں۔ اس طرح دوسرے دیش والے ہمارا دھن ڈھولے جاتے ہیں۔ بے چارے جُلاہے کنگال ہو گئے۔ کیا ہمارا یہی دھرم ہے کہ اپنے بھائیوں کی تھالی چھین کر دوسرے کے سامنے رکھ دیں؟" (7)

نو آبادیاتی معاشی و صنعتی استحصال سے قبل مقامی لوگ دیسی(دستی) صنعتوں کا استعمال کرتے تھے۔ برصغیر میں جو دیسی کپڑا بنتا تھا وہ غیر ملک فروخت کیا جاتا تھا۔ استعماری تاجروں اور برطانوی صنعت کاروں نے مقامی صنعت کو ختم کر کے مشینی کپڑا فروخت کرنا شروع کیا۔ مقامی کپڑے کی مانگ دن بدن کم ہوتی گئی۔ برطانوی کپڑے کی مانگ(فروخت) مسلسل بڑھنے لگی۔ ان حالات میں برصغیر میں سودیشی تحریک کا آغاز ہوا۔ جس کا بنیادی مدعا دیسی صنعتوں کے استعمال اور بدیسی مصنوعات سے بائیکاٹ کرنا تھا۔ یہ معاشی ردِ استعماریت پسندانہ عمل تھا۔ چودھری بدیسی مصنوعات سے بائیکاٹ کر کے دیسی صنعت و مصنوعات کی طرف راغب کرتے ہوئے کہتا ہے:

"اپنے گھر کا بنا ہوا گاڑھا پہنو، عدالتوں کو تیاگو، نشے بازی چھوڑو، اپنے لڑکوں کو دھرم کرم سکھاؤ، میل سے رہو، بس یہی سوراجیہ ہے، جو لوگ کہتے ہیں سوراجیہ کے لیے خون کی ندی بہے گی، وہ پاگل ہیں۔ ان کی باتوں پر دھیان مت دو۔"(8)

عدم تعاون کا تعلق سیاسی و انتظامی اطاعت شعاری سے گریز اور سودیشی تحریک کا تعلق بدیسی اشیا کی خرید وفروخت پر پابندی سے تھا۔ ان دونوں تحریکوں نے برطانوی استعماری نظام کو سیاست اور تجارت دونوں سطح پر چیلنج کیا، اس سے مزاحمت و بغاوت کی یوں ان دونوں تحریکوں کے ملک گیر اثرات مرتب ہوئے۔ بدیسی کپڑا، عدالتی نظام اور نشہ آور ادویات تینوں استعمار کی عطا کردہ ہیں۔ کپڑے کی صنعت سے انھیں کثیر دولت میسر آئی۔ عدالتی نظام میں انصاف اسی کو نصیب ہوا جس کے پاس پیشہ، منصب اور طاقت تھی، رشوت کے اس نظام نے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو مضبوط استعماری معاون بنا دیا۔ نشے سے کروڑوں روپیہ سرکار کے خزانے میں گیا۔ ان تینوں سے بائیکاٹ، پرہیز اور عدم تعاون وطن سے محبت، اس کی ترقی، آزادی اور معاشی مضبوطی کے لیے کوشش و جدوجہد کی دلیل تھی۔ استعماری اداروں، صنعتوں اور مصنوعات سے گریز ردِ استعماری رویہ ہے۔

سوراجیہ کا مخالف بھگت جی ایک دن چودھری اور سامعین کے سامنے آ کر ان کی حمایت کرتے ہوئے سوراجیہ میں شمولیت کا اعلان کرتا ہے۔ اور یوں تین نسلوں کی عداوت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ 'لاک ڈاٹ' میں 'ہندو مسلم اتحاد' کا جو جذبہ ظاہر ہوا ہے۔ یہی جذبہ پریم چند کے آئندہ افسانوں میں قوی تر نظر آتا ہے۔

استعماری اور نو آبادیاتی نظام سے نجات کے حصول کے لیے ہندو مسلم اتحاد، وطن پرستی، حب الوطنی اور قوم پرستی (جس کے اولین جہت برصغیر کے تناظر میں غلبہ پسند نہیں بلکہ مدافعانہ ہے) کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ہندوستانی قوم پرستی جس کا تعلق جارحانہ نہیں بلکہ مدافعانہ ہے، وہ عدم تشدد کی حامی ہے۔ استعماری قوم پرستی ہمیشہ تشدد پسند رہی ہے۔ اس کے برعکس ہندوستانی قومیت، غیر قوم پر غلبہ پانے کے لیے نہیں، غلبہ سے نجات پانے کے لیے ردِ استعماری رویے سے مملو رہی ہے۔ 'لاک ڈاٹ' میں تشدد کا جواب تشدد سے نہیں عدم تشدد کے گاندھیائی فلسفہ سے دینے کا درس دیا گیا ہے۔ ہندوستانیوں میں پیدا ہونے والا ردِ استعماری رویہ استحصال کرنے کا نہیں، استحصال سے بچنے کا، تشدد اپنانے کا نہیں تشدد کو روکنے کا، تہذیبی غلبہ اختیار کرنے کا نہیں مغربی تہذیبی یلغار سے نجات پانے کا، دوسری قوم کی شناخت مسخ کرنے کا نہیں اپنی مقامی شناخت کو بچانے کا رہا ہے۔ ہندوستانی مقامیوں نے عدم تعاون کو دو سطحوں پر اپنایا اول سرکاری ملازمتوں سے مستعفیٰ ہوئے دوم بدیسی اشیا کو خرید و فروخت کو ترک کر دیا۔

افسانہ 'لال فیتا' کا مرکزی کردار ہری بلاس نو آبادیاتی ادارے عدالت میں پندرہ سال سرکاری ملازم رہتا ہے۔ ہری بلاس اس لیے مستعفی ہو جاتا ہے کہ اب اسے انصاف نہیں، انصاف کا خون کرنے، رعایا کی آزادی اظہار

رائے کو سلب کرنے اور آزادی کی تحریکوں کو دبانے کے لیے سرکاری احکامات جاری کیے گئے۔ وہ ملک و قوم کی خاطر اپنی ملازمت سے مستعفی ہو جاتا ہے۔ استعماری حکومت ہری بلاس کو اپنے استعماری مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہے لیکن وہ سرکاری ملازمت کو قوم کے لیے مفید سمجھتے ہوئے دیانت داری سے کام کرنے کا متمنی ہے۔ سرکاری احکامات کے بعد ہری بلاس سوچتا ہے:

> "میرا کام انصاف کا خون کرنا ہے، میرا فرض ہے کہ میں دیہاتوں میں اخبار بین لوگوں پر نگاہ رکھوں۔ جو لوگ کسانوں کی حمایت پر آمادہ نظر آئیں۔ جو لوگ انھیں رسد اور بیگار دینے سے علانیہ یا اشارۃً روکیں ان کو تنبیہ کروں۔ ان سادھو، سنیاسیوں اور بازپرس کروں جو عوام میں دھرم اپدیش کرتے پھرتے ہیں۔ جن لوگوں کو چرخے اور کرگھے کے استعمال کی ترغیب دیتے ہوئے دیکھوں، جسے گاڑھے اور کھدر کے کپڑے پہنے ہوئے پاؤں اس کا نام بھی اپنے روزنامچے میں درج کروں۔ جو لوگ قومی مدارس کی امداد کریں جو قومی مجلسوں میں شریک ہوں، نہیں بلکہ ان پاک نفسوں کو بھی اپنی جان خطرے میں ڈاک کر وبا اور طاعون میں رعایا کی جان بچاتے ہیں اور مفت دوائیں تقسیم کرتے پھرتے ہیں سرکشوں میں شمار کروں اور مسکرات کے معاملے میں چوں وچرا کرنے والوں کو فوراً شکنجے میں کس دوں۔ خلاصہ یہ کہ مجھے قوم کے دوستوں اور قوم کے خادموں کا دشمن بننا چاہیے۔"(9)

ہری بلاس قوم و ملک کی حقیقی روح سے آشنا ہیں۔ وہ سرکاری احکامات و منشا کو سمجھتے ہیں۔ یہ احکامات حکومتی و سرکاری سے زیادہ استعماری ہیں۔ استعمار کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ مقامیوں کو متحد، منظم اور یکجا نہ ہونے دیا جائے۔ اتنے بڑے ملک کو کنٹرول کرنا استعماری باشندوں کے لیے آسان نہ تھا انھوں نے مقامی افسروں کے ذریعے ہی عوام کو اپنے تصرف میں رکھا۔ ہری بلاس استعماری احکامات جو مقامیوں کو دبانے، مغلوب رکھنے، ڈرانے، خوف میں مبتلا رکھنے، ان کی آزادی و بیداری کو ختم کرنے، ان کی شناخت مسخ کرنے اور ان کا اتحاد پیدا کرنے میں رکاوٹ پیدا کرنے والے تھے، کو ماننے، تسلیم کرنے اور بجالانے سے انکار کر دیتا ہے۔ سرکار سے عدم تعاون کا یہ رویہ ردِ استعماری رجحان کا حامل ہے:

> "عدم تعاون پریم چند کی نظر میں صرف سیاسی نعرہ نہیں تھا بلکہ یہ حق و انصاف اور ضمیر کی لڑائی بھی تھی حکومت کا کام رعایا کے جائز حقوق اور جان و مال کی حفاظت کرنا ہے۔ اور جب تک کوئی حکومت ان ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہوتی ہے اس کے ساتھ کرنا چاہیے لیکن جب وہ ان ذمہ داریوں اور فرائض کی قاتل بن جاتی ہے تو اس کے ساتھ ترک تعاون ہی سچی انسان، ملک او رقوم دوستی ہے۔"(10)

مذکورہ اقتباس میں جس حکومت سے حق و انصاف کی طلب اور جان ومال کی حفاظت کی خواہش کی گئی ہے وہ حقیقی معنوں میں قومی ریاست کی جمہوری حکومت ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن استعماری حکومت سے حق، انصاف، جان ومال کی حفاظت اور ترقی کی امید نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی وہ اس پر عمل کر سکتی ہے کہ اس کی اصل منشا سرمایہ ہے۔ 'لال فیتہ' کا کردار استعمار معاون کردار اپنانے سے انکار کر دیتا ہے۔ حب الوطنی اور ملک و قوم کے لیے اس کا یہ عمل ردِ استعماریت کا حامل ہے۔

پریم چند نے سیاسی حالات کے پیشِ نظر عدم تعاون کی تحریک کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جن افسانوں میں اس تحریک کو موضوع بنایا ہے ان میں بیوی سے شوہر، سمیریا ترا، سہاگ کا جنازہ، ڈائل کا قیدی اور آخری تحفہ شامل ہیں۔ یہاں بطور خاص ذکر افسانہ 'بیوی سے شوہر' کا کیا جاتا ہے۔ افسانے میں دو کردار شوہر (مسٹر سیٹھ) اور بیوی (گوداوری) متضاد خیالات رکھتے ہیں۔ مسٹر سیٹھ استعمار معاون، غیر ملکی آقاؤں کا پرستار، مغربی تہذیب کا دلدادہ، مغربی طرزِ حیات اپنانے کا سختی سے قائل اور ہندوستانی آزادی کی حامل تحریکوں کا سخت مخالف ہے۔ جبکہ اس کی بیوی گوداوری ہندوستانیت سے محبت کرنے والی، مقامیت کے احساس سے سرشار، دیسی اشیا کے استعمال کی خواہش مند، ولایتی چیزوں سے متنفر، ملکی آزادی و قومی بیداری کی تحریک کانگریس کی حامی ومالی معاونت کرنے والی ملکی ترقی و آزادی کی متوالی، شوہر کی فرمانبردار مگر اظہار رائے کی جرات کی حامل خاتون ہے۔

مسٹر دینا ناتھ سیٹھ ان ہندوستانیوں کا نمائندہ کردار ہے جو ہندوستانی اشیا، مزاج و بود و باش، طرزِ حیات، رہن سہن، زبان، لباس، سوچ، فکر، اقدار کے مخالف اور مغرب پرستی، مغربی تقلید، مغرب زدگی کا بری طرح شکار ہیں۔ انگریزی وضع اختیار کرنے اور انگریزی غلامی کو باعثِ فخر و خوشنودی خدا تصور کرتے ہیں۔ یہ ہندوستانی کس حد تک ولایتی بود و باش، اشیا اور طرزِ حیات کو اپناتے ہیں، افسانے میں مسٹر سیٹھ کی ایک جھلک دیکھیے:

> "مسٹر سیٹھ نے ولایتی ٹوتھ پاؤڈر، ولایتی برش سے دانتوں میں ملا۔ ولایتی صابون سے نہایا۔ ولایتی چائے ولائتی چائے کے سیٹ میں پیا۔ ولایتی بسکٹ، ولایتی مکھن کے ساتھ کھایا۔ ولایتی دودھ پیا۔ پھر ولایتی سوٹ زیبِ تن کر کے ولایتی سگار ہونٹوں میں دبا کر گھر سے نکلے۔ سڑک پر ولایتی موٹر کھڑی تھی۔ اس میں بیٹھ کر فلاور شو دیکھنے چلے گئے۔"(11)

ہولی کے دن فدائیانِ حریت، مقامیت سے محبت اور غیر ملکی حکمرانوں و اشیا سے متنفر آزادی کے متوالوں اور قومی جانثاروں کا جلوس مسٹر سیٹھ کے مکان کے سامنے ولایتی اشیا کو جلانے لگتا ہے۔ گوداوری کا دل کرتا وہ بھی گھر سے سب ولایتی اشیا ہولی کی نذر کر دے لیکن شوہر کی ناراضگی کے خوف سے ایسا نہیں کر پاتی۔ مسٹر سیٹھ گھر آتے ہی آزادی کے متوالوں کو احمق قرار دیتے ہوئے ملک پر استعماری حکومت کو پرماتما کی عطا، مرضی، رضا اور خوشنودی سے

منسوب کر کے، اپنے ہندوستانی ہونے پر افسوس کا اظہار کرتا ہے مگر یہ کہہ کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ؛'کم سے کم میں نے اپنی بودوباش، طور طریقے، قول و فعل میں کوئی ایسی بات تو نہیں رکھی جس سے کوئی مجھے ہندوستانی سمجھے۔

سیٹھ کی بیوی کانگریس کے جلسے میں جاتی ہے، قومی جانثاروں کی حمایت اور قومی سیاسی جماعت کی مالی معاونت کرتی ہے۔ سیٹھ کو بیوی کا یہ عمل ناگوار گزرتا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ کانگریس استعماری سرکار کی مخالفت کر رہی ہے، کانگریس کی حمایت و معاونت دراصل نوآبادیاتی استعماری حکومت کے خلاف ہونے کے مترادف ہے۔ بیوی کا یہ عمل سیٹھ کے آفس تک پہنچ جاتا ہے۔ سیٹھ کو صاحب دغاباز، نمکحرام اور شیطان کہہ کر رول مارنے دوڑتا ہے۔ صاحب کے اس عمل کو دیکھ کر سیٹھ آگے بڑھ کر صاحب کو زبردست گھونسا رسید کرتا ہیں اور ساتھ اپنا استعفٰی لکھ دیتا ہے۔ گوداوری، شوہر کی استعمار معاونت اور مرعوبیت کو سخت نفرت سے دیکھتی ہے۔ وہ اب ہرگز برداشت نہیں کر سکتی کہ مزید شوہر کے اشاروں پر چلتے ہوئے، آزادی کی تحریک سے الگ رہے، استعماری مخالفت چھوڑ دے اور ولایتی اشیا مسلسل استعمال کرے۔ وہ شوہر کے بارے کیا سوچتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "میری ہستی ان کی ہستی میں کیوں مدغم ہو؟ انھیں اپنے قول و فعل کا اختیار ہے مجھے اپنے قول و فعل کا اختیار نہیں۔ یہ اپنے سرکار کی غلامی کریں۔ انگریزوں کے چوکھٹ پر ناک رگڑیں۔ مجھے کیا غرض ہے کہ ان کی شریک بنوں جو خود غلام ہے اس کی غلامی کیوں کروں۔۔۔ غلامم کے لیے کوئی شرط نہیں اس کی جسمانی غلامی پیچھے ہوگی۔ روحانی غلامی پہلے ہے۔۔۔ انگریزوں سے بھی زیادہ انگریز بنے ہوئے ہیں۔ وفا کی قبر پر لات مار رہے ہیں۔ میں کیوں ان کے پیچھے اپنی عاقبت بگاڑوں۔"(12)

گوداوری میں قومی و ملکی وفاداری کا شعور ہے۔ جو اسے غیر ملکی غلام بننے دیتا ہے نہ اسے شوہر کی غلامی قبول ہے۔ جب سیٹھ استعماری ملازمت سے مستعفی ہو کر آتا ہے تو گوداوری میں قومی وفاداری، حب الوطنی اور ملکی آزادی کے جذبے کے ساتھ غیر ملکی غلامی کا احساس اس قدر پختہ ہوتا ہے کہ وہ شوہر سے کہتی ہے؛"پرماتما کا شکر کیوں نہیں ادا کرتے کہ تم اس غلامی سے آزاد ہو گئے۔" اس کے بعد دونوں شوہر بیوی ولایتی چیزوں کو ترک کر کے مقامی اشیا کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ 'بیوی سے شوہر' تک اس رد استعماری رویے کو افسانے میں پیش کیا گیا ہے۔

یہ افسانہ دو متضاد خیالات کے حامل ان کرداروں کی سوچ اور فکر کو بیان کرتا ہے جو نقل و گریز کے باعث متصادم ہونے کے بجائے متحد ہو جاتے ہیں۔ پریم چند نے ولایتی اشیا سے نفرت، قومی آزادی کی سیاسی جماعت سے محبت و معاونت کے جذبے، بیوی کی شوہر سے نظریاتی عدم وابستگی اور شوہر کا غیر ملکی حکمرانوں، تہذیب، طرزِ حیات، بودوباش اور ملازمت سے بائیکاٹ کر کے بیوی کی اطاعت شعاری کی ہامی بھرنے تک کو دکھا کر ردِ استعماریت کو موضوع

بنایا ہے۔ ایک مرعوبی ذہنیت رکھنے والے شخص کا اپنے آقا کو گھونسا مار کر ملازمت سے مستعفی ہو کر مغربی طرزِ حیات و بود و باش سے نفرت کا ایسا اظہار قاری کو غیر معمولی طور پر دیکھنا پڑتا ہے۔ ہندوستانی عورت جس قدر مغربی آرائش، زیبائش اور نمائش سے لاتعلقی ہو کر وطنی محبت اور قومی اتحاد و آزادی کی خواہش اپنے عمل سے دکھاتی ہے، قابلِ تحسین ہے۔ گوداوری ردِ استعماری جذبات رکھنے والی ہندوستانی عورت کا کردار ہے۔

پریم چند نے 'جلوس' اور 'آشیاں برباد' میں قومی آزادی کے راہنماؤں کی جانثاری، قومی وفاداری، آزادی کی جدوجہد، اور ملک و قوم سے محبت کو موضوع بنایا ہے۔ استعماری مظالم، تشدد اور جبر بھی ان افسانوں سے عیاں ہے۔ افسانہ 'جلوس' کا ابراہیم قومی راہنما ہے۔ جو استعماری جبر کے سامنے ملکی و قومی مفاد و آزادی کے لیے ڈٹ جاتا ہے۔ وہ آزادی کے متوالوں کے جلوس کی قیادت کرتے ہوئے سرکاری عملے کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ جلوس کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ہر قسم کے جبر، تشدد اور رکاوٹ کو عبور کرنے کے لیے تیار ہے اس کے لیے چاہے اس کی جان قربان ہو جائے۔ کانگریس کی طرف سے قومی آزادی کے حصول اور استعماری سرکار کے خلاف نکلنے والے پُرامن جلوس کو پہلی رکاوٹ سے اس وقت گزرنا پڑا جب بیربل سنگھ جلوس کو مقرر حد سے آگے بڑھنے سے روکتا ہے۔ جلوس کو بیربل واپس جانے کا حکم دیتا ہے تو ابراہیم کہتا ہے:

> "واپس تو ہم نہ جائیں گے۔ آپ کو یا کسی کو بھی ہمیں روکنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آپ اپنے سواروں، سنگینوں اور بندوقوں کے زور سے ہمیں روکنا چاہتے ہیں۔ روک لیجیے۔ مگر آپ ہمیں واپس نہیں کر سکتے۔"(13)

بیربل نے آزادی کے اس جلوس پر دھاوا بول دیا جس کے نتیجے میں ابراہیم مارا گیا۔ گھر پہنچ کر بیربل کو اس قتل کا احساس ہوا جس کا اعتراف وہ اپنی بیوی کے سامنے کرتا ہے، جو قومی جانثاروں سے کارکنوں سے محبت کرنے والی ہے۔ بیربل بتاتا ہے کہ ڈی ایس پی کو موجودگی اور سرکاری ترقی پانے کے لیے اسے جلوس روکنا پڑا۔ اس کی بات بیوی پر ناگوار گزری وہ اس ناگواری کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہے:

> "شاید تمھیں جلد ترقی بھی مل جائے، مگر بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگ کر ترقی پائی تو کیا پائی! یہ تمھاری کارگزاری کا انعام نہیں، تمھاری غداری کی قیمت ہے۔ تمھاری کارگزاری کا انعام تو اس وقت ملے گا جب تم کسی خونی کو کھوج نکالو گے، کسی ڈوبتے ہوئے آدمی کو بچالو گے۔"(14)

استعماری حکومت نے مقامیوں میں اٹھنے والی ہر قسم کی مزاحمت اور بغاوت کو کچلنے، دبانے اور روکنے کے لیے مقامی لوگوں کو ہی اپنا معاون بنایا۔ استعمار معاون کی بیوی کا اپنے شوہر کے لیے یہ رویہ حب الوطنی کی عمدہ مثال

ہے۔ اقتباس سے انسان دوستی کا واضح اشارہ ملتا ہے۔ بیر بل سنگھ مقامی استعمار معاون افسر ہے۔ وہ قوم کی حیثیت، قومی مفاد کی اہمیت، قومی غیرت کے تقاضوں، قومی آزادی کی ضرورت اور غلام زندگی کی تلخی کو سمجھتے ہوئے بھی سرکاری ترقی کے حصول اور افسرانِ بالا کے سامنے اپنی پیشہ ورانہ سرگرمیوں کو ظاہر کرنے کے لیے اسے آزادی کے جلوس پر حملہ کرنا پڑتا ہے مگر اس کے دل میں اس عمل کی شرمندگی کا احساس قوی ہے، اسے معلوم ہے:

"میں عقلمند نہ سہی پر اتنا جانتا ہوں کہ یہ لوگ ملک و قوم کو آزاد کرانے کے لیے ہی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ سرکار اس خیال کو پامال کر دینا چاہتی ہے۔ ایسا گدھا نہیں کہ غلامی کی زندگی پر فخر کروں لیکن حالت موجودہ سے مجبور ہوں۔"(15)

ابراہیم کے جنازے کے ساتھ جاتے بیر بل سنگھ کو عورتیں اور مرد حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس میں احساسِ جرم قوی تر ہوتا جاتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ ملک کی بہبودی کے لیے جان ہتھیلی پر رکھنے والوں سے ہمارا یہ سلوک ہماری بد نصیبی ہے کہ جن کی مدد کرنا تھی ان کی مخالفت کر رہے ہیں۔ بیر بل اپنے استعمار معاون کردار پر شرمندہ ہوتا ہے۔ اور ابراہیم کی بیوہ کے سامنے جا کر معافی مانگتا ہے۔ قومی غیرت اس میں اس قدر اجاگر ہوتی ہے کہ وہ اپنے جرم کی پاداش میں خودکشی کر لیتا ہے۔

افسانہ 'جلوس' میں تین کردار ابراہیم، بیر بیل سنگھ اور اس کی بیوی قومی و ملکی آزادی و مفاد کا احساس رکھتے ہیں۔ استعماری جبر کے خلاف ہندوستانی جلوس اس افسانے کا موضوع ہے۔ کرداروں کی ملک و قوم کی خاطر قربانی، جانثاری اور وفاداری ردِ استعماری رویہ ہے۔ بیر بل کی قومی غیرت غیر معمولی ہے۔ عورتوں کا جلوس میں شامل ہو کر قومی شہید کو خراجِ تحسین اور استعماری اہلکاروں کو لعن طعن کرنے کا عمل ردِ استعماری رجحان کو محیط ہے۔ قومی آزادی کے جلوس میں شامل کارکنوں کا استعماری جبر کے سامنے ڈٹ جانا، مردوں کے ساتھ عورتوں کا جذبہ حریت وآزادی میں مبتلا ہونا اور استعماری معاونین کا قومی احساسِ جرم میں مبتلا ہونا اپنے تئیں ردِ استعماریت ہے۔

'آشیاں برباد' قومی آزادی و قومی جدوجہد کرنے اور اپنا آشیاں برباد ہو جانے والی دو استعمار مخالف آزادی کی متوالیوں چھما اور مردلا کی کہانی ہے۔ دونوں عورتوں کا آشیاں برباد ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ آزادی کی جدوجہد برابر جاری رکھتی ہیں۔ دونوں کو جیل ہو جاتی ہے۔ چھما کا شوہر اور لڑکے جلیانوالہ باغ میں استعماری گولی کا نشانہ بنے تھے۔ چھما کو سرکار مخالف تقریر کرنے پر جیل ہوتی ہے۔ دس سال استعماری قید کی زندگی گزار کر اس کا دل و دماغ مسلسل قوم ، ملک کے درد اور خدمت کے لیے مچلتا رہتا ہے۔ وہ نو آبادیاتی حکومت سے نجات پانے اور قومی آزادی کی خدمت کرنے یا جان تک دینے کو عبادت سمجھتی ہے۔

استعماری اہلکاروں نے گاؤں کے ایک کسان کو لگان نہ دینے پر مار ڈالا۔ نتیجے میں گاؤں کے کسان شہریوں کے ساتھ مل کر پولیس اور عوام دشمن استعماری سرکار کے خلاف شہر میں پچاس ہزار کا جلوس نکال کر آزادی کے نعرے لگانا شروع کر دیتے ہیں۔ پولیس گولی چلا دیتی ہے جس سے مردلا کے سوامی، ماں اور بیٹا بھان مارے جاتے ہیں۔ مردلا میں بجائے خوف، ڈر کے جذبہ آزادی، قومی غیرت اور قومی درد پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ آزادی کی جدوجہد کے لیے نکل پڑتی ہے اور مظاہروں میں پیش پیش رہتی ہے۔ مردلا جیل میں آکر چھما کو بتاتی ہے:

> "لوگ کہتے ہیں جلوس نکالنے سے کیا ہوتا ہے؟ اس سے معلوم ہوتا ہے ہم زندہ ہیں۔ مستعد ہیں میدان سے ہٹے نہیں ہیں۔ ہمیں اپنی ہار نہ ماننے والی خودداری کا ثبوت دینا تھا۔ یہ دکھانا تھا کہ ہم تشدد سے اپنا مطالعہ آزادی سے دست بردار ہونے والے نہیں، ہم اس نظام کو بدل دینا چاہتے ہیں جس کی بنیاد خود غرضی اور خون چوسنے پر رکھی گئی ہے۔۔۔ کانگریس کی صدارت کا فخر مجھے عطا کیا گیا تھا۔۔۔ میں اپنے دل میں ایک عجیب طاقت کا احساس کر رہی تھی۔ ایک کمزور عورت جسے بولنے کا بھی شعور نہیں جس نے کبھی گھر سے قدم نہیں نکالا۔ آج اپنے پیاروں کی قربانی کی بدولت اس مرتبہ پر پہنچ گئی جو بڑے بڑے سرکاری افسر کو بھی بڑے سے بڑے مہاراجہ کو بھی حاصل نہیں۔ یہ دلوں کی حکومت تھی، یہ مجمع کیا میرا تنخواہ دار تھا یا اسے مجھ سے کسی نفع کی امید تھی یا نقصان کا خوف تھا ہر گز نہیں۔ پھر بھی وہ میرے کڑے سے کڑے حکم کو ماننے کو تیار تھے اس لیے کہ ان کے دلوں میں آزادی کی جو تڑپ، غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی جو بے چینی ہے میں اس تڑپ اور بے چینی کی زندہ مثال ہوں۔"(16)

استعماری نظام چوں کہ اپنی اصل میں مقامیوں کے لیے نقصان دہ اور استحصالی حیثیت رکھتا ہے اس لیے وہ مقامیوں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوتا ماسوائے استعماری طبقہ کے، جو استعمار کار کے ساتھ مل کر ان سے اول مرعوب ہوتا دوم نجی معاشی مفاد حاصل کرتا ہے۔ یہ معاون طبقہ بھی استعماریت کو مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس نظام کو بدلنے، ختم کرنے اور اس سے نجات پانے کے لیے مقامی تحریکیں شروع ہوتی ہیں۔ استعمار انھیں بغاوت کا نام دیتا ہے۔ یہ نظام مقامیوں کو ہر طرح سے مغلوب کرتا ہے، اور ان کا استحصال کر کے خود طاقت حاصل کرتا ہے۔ بظاہر نو آبادیاتی نظام خوش کن دعوے ساتھ لاتا ہے مگر اس کی نوعیت خود غرض اور ذاتی مفاد کی حامل ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا اقتباس میں ہندوستانی حریت پسند عورت کے جذبات بیان کیے گئے ہیں۔ وہ جلوس نکالنی چاہتی ہے، اس کی حیثیت قائد کی ہے، وہ تشدد کے باوجود آزادی کی طالب ہے۔ پیاروں کی قربانی اور آشیاں برباد ہونے کے باوجود وہ آزادی کی جدوجہد جاری رکھنے کا عزم کیے ہوئے ہے۔ ہندوستان کی آزادی کی خاطر لوگوں نے بے لوث

جدوجہد کی۔ ہر فرد کی تڑپ ملک و قوم کی خاطر تھی۔ اس افسانے میں عورتوں کے جذبہ حریت، جاںنثاری، قومی وفاداری اور آزادی کے جوش وولولہ کو دکھایا گیا ہے۔ نوآبادیاتی نظام اور برطانوی استعماری سرکار سے چھٹکارے کے لیے مرد اور عورتوں دونوں نے برابر کوشش وجدوجہد کی، آزادی کی تحریکوں کو مضبوط بنایا اور ردِ استعماری فکر و عمل کا اظہار کیا۔

نوآبادیاتی نظام جبر اور تشدد اختیار کیے بغیر قائم نہیں ہو سکتا۔ اس نظام کے خاتمے، اس سے نجات پانے اور آزادی حاصل کرنے کے لیے تشدد کی راہ اختیار کرنا پڑتی ہے۔ مقامیوں میں اس نظام سے نجات کے دو راستے پائے جاتے ہیں۔ تشدد اور عدم تشدد۔ برصغیر میں مقامیوں میں نوآبادیاتی حکمرانوں کی مخالفت میں، قوم کے درد و غم اور ملک کی آزادی کے لیے دونوں رویوں سے جنم لیا۔ تشدد پسند انقلابی خفیہ تنظیم جس کا مشن اور ہدف استعماری حکمران ،انگریز اور استعماری افسران و معاون طبقہ کا قتل تھا۔ پریم چند نے اس تنظیم کی کارروائی کو بھی افسانوں کا حصہ بنایا ہے۔ یہ ردِ استعماریت کی انتہائی سطح تھی۔ افسانہ 'قتل' میں ماں اور بیٹا دو کردار ہیں۔ یہ کردار استعماری نظام، استحصالی قوتوں، ظالم کرداروں اور ملک دشمن عناصر کے خلاف ہیں۔ دونوں میں قوم و ملک کی محبت اور وطن کی غیر ملکی استبداد سے نجات کی خواہش ہے۔ دونوں قوم کی خیر خواہی میں مبتلا قوم پرستی کے جذبہ سے سرشار ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ماں ملک و قوم کی نجات کے لیے عدم تشدد اور بیٹا قوم کی خدمت، قومی انتقام اور آزادی کے لیے تشدد کی راہ اختیار کیے ہوئے ہے۔ ماں کو جب بیٹے کے پر تشدد عزائم معلوم ہوتے ہیں تو بیٹے کو پانچ ماہ اس تنظیم میں شمولیت اختیار کیے ہوتے ہیں جو استعماری نظام اور تشدد کا جواب تشدد سے دینے کے نظریے پر سختی سے عمل پیرا ہیں۔ تشدد پسند بیٹے کے مطابق:

> "وہ (انگریز) ہندوستانی اسی وقت چھوڑیں گے۔ جب انہیں یقین ہو جائے گا، کہ اب وہ ایک لمحہ بھر بھی نہیں رہ سکتے۔ اگر آج ہندوستان کے ایک ہزار انگریز قتل کر دیئے جائیں۔ تو آج ہی سوراجیہ مل جائے۔ روس اسی طرح آزاد ہوا، آئرلینڈ بھی اسی طرح آزاد ہوا اور ہندوستان بھی اسی طرح آزاد ہو گا اور کوئی طریقہ نہیں۔ ہمیں ان کا خاتمہ کر دینا ہے۔ اگر ایک گورے افسر کے قتل کر دینے سے حکومت پر جتنا خوف طاری ہو جاتا ہے، اتنا ایک ہزار جلوس سے ممکن نہیں۔"(17)

بیٹے کے ان پر تشدد خیالات سے ماں خوف زدہ ہو جاتی ہے، وہ خود بھی جذبہ قومیت اور قوم کی فلاح و خیر خواہی کی متمنی ہے لیکن تشدد کے خلاف اور عدم تشدد کی حامی ہے۔ ماں نوآبادیاتی حکومت اور سرمایہ داریت کے خلاف ہے۔ وہ انگریزوں کی دشمن نہیں بلکہ انگریزی استعماریت کے خاتمے کو چاہتی ہے۔ وہ ملک پر غیر ملکی حکومت و تسلط کو غیر آئینی قرار دیتی ہے۔ معاشی شعور رکھتی ہے کہ سرمایہ داریت کے ذریعے پیسہ ملک سے باہر جا رہا ہے۔ ماں

بیٹے کو پر تشدد عزائم سے باز رہنے کا کہتی ہے اور اسے کمینہ پن اور قوم فروشی سمجھتی ہے کہ قتل کوئی کرے اور اس کا خمیازہ قوم کا بے گناہ فرد بھگتے۔ لیکن بیٹا اس سوچ کا حامل ہے کہ 'جو آدمی قوم کی زیادہ خدمت کر سکتا ہے اسے زندہ رہنے کا زیادہ حق ہے'۔ اس نظریے کے تحت وہ ایک رات صاحب کو قتل کرنے کے لیے نکلتا ہے اور ماں ساتھ ہو جاتی ہے۔ عین موقع پر صاحب پر گولی چلا دیتا ہے، ماں سامنے آجاتی ہے، گولی ماں کو لگ جاتی ہے اور ماں مر جاتی ہے۔ افسانے میں دو نظریے، دو کرداروں کے ذریعے پیش کیے گئے ہیں۔ اول تشدد جس کا راستہ ہندوستانی خفیہ جماعت نے اختیار کیا دوم عدم تشدد جس کا راستہ کانگریس اختیار کرتی ہے۔ اول الذکر استعمار، استعمار معاون اور استعماری افسران کے قتل سے آزادی جبکہ موخر الذکر مظاہرے، جلسے، جلوسوں اور پر امن احتجاج سے استعماری نظام سے نجات کے حصول کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ دونوں کی منزل ایک جبکہ طریقہ کار الگ الگ ہیں۔ یہ افسانہ ردِ استعماریت پسند تنظیم کی انتہا پسندی اور تشدد پسندیت کو اجاگر کرتا ہے۔

پریم چند کے افسانے 'قاتل کی ماں' میں دو کردار تشدد اور عدم تشدد کے متضاد خیالات کے حامل ہیں۔ ونود اور رامیشوری۔ ونود متشدد گروہ میں شامل ہو کر انگریز افسر کو قتل کرتا ہے جبکہ اس کی ماں رامیشوری جو عدم تشدد کے نظریے کی سختی سے پابند ہے کا عقیدہ اور دھرم یہ ہے کہ:

> "دھرم اور نیتی کو ہمیشہ فتح حاصل ہوئی ہے۔ اور آئندہ بھی ہو گی۔ سوراجیہ قتل، خون سے نہیں ملتا، تیاگ، تپ اور آتم شدھی سے ملتا ہے۔ لالچ چھوڑتے نہیں، بری خواہشات چھوڑتے نہیں، اپنی برائیاں دیکھتے نہیں، اس پر دعوا ہے سوراجیہ لینے کا (مطلب) یہ سمجھ لو جو سوراجیہ قتل وخون سے ملے گا وہ قتل، خون پر ہی قائم رہے گا۔ عوام کی کوشش سے جو سوراجیہ ملے گا وہ ملک کی چیز ہو گی اور تھوڑے سے آدمیوں کا ایک گروہ تلوار کے زور سے انتقام کرے گا۔ ہم عوام کا سوراجیہ چاہتے ہیں، قتل وخون کی طاقت رکھنے والے گروہ کا نہیں۔"(18)

رامیشوری 'قاتل کی ماں' کی حیثیت سے قاتل کے خلاف شدید کشمکش کے بعد عدالت میں بالآخر اپنے بیٹے کے جرم کا اعتراف کر لیتی ہے کہ وہ قاتل کی ماں ہے۔ لوگ حیرت اور خوشی میں اس طرف دیکھتے ہیں، اتنے میں مجمع میں سے ایک شخص اس کے سینے میں چاقو اتار دیتا ہے، وہ اس کا بیٹا ونود ہوتا ہے، ماں گر کر مر جاتی ہے۔

افسانہ 'قاتل' اور 'قاتل کی ماں' پریم چند کے دو متضاد خیالات رکھنے والے کرداروں ماں اور بیٹے پر مشتمل ہیں۔ دونوں افسانوں میں دونوں مائیں اپنے بیٹوں کے ہاتھوں قتل ہوتی ہیں۔ ان افسانوں کا پسِ منظر یہ ہے کہ اس وقت ملک کے سیاسی حالات ایسے ہو گئے تھے کہ استعماری حکومت سے مطالبہ، خود مختار ہونے کی خواہش، مقامی حکومت کے قیام کی فکری آرزو شدت اختیار کر گئی تھی جبکہ نو آبادیاتی سرکار انھیں جکڑے ہوئے تھی۔ انگریز آسانی سے ملک

چھوڑنے والے نہ تھے۔اس صورتحال کے پیشِ نظر ملک میں جو سیاسی تحریکیں چل رہی تھیں،نے تشدد کی راہ اپنائی،ان کا دھرم، مشن، مقصد اور منشایہی بن گیا کہ انگریز برطانوی استعماریت سے آزادی درکار ہے تو ان کو تشدد کے ذریعے ملک چھوڑنے پر مجبور کیا جائے۔یہ تصور اس قدر توانا، مضبوط، سخت اور انتہا پر پہنچا کہ جو نوجوان اس متشدد تحریک میں شامل ہوتا وہ بقیہ زندگی اس میں وقف کر دیتا اور مقاصد کی تکمیل میں سرگرم رہتا۔ملک و قوم کی خاطر استحصال کار سے ٹکرانے کا یہ متشدد انداز انقلاب پسند سیاسی شعور کے حامل نوجوانوں میں تیزی سے ابھرنے لگا۔یہ وہی قوم پرستی کا ہی ایک پہلو ہے جس کا آغاز یورپ سے ہوا تھا۔یورپی قوم پرستی قومی ریاستوں سے ابھری جس کے مطابق اپنے ملک و قوم و ریاست کے لیے دوسرے انسانوں کا خون بھی کرنا ہو تو کر دیا جائے۔اس تصور کے مطابق یورپی لوگوں (تاجر، حکمران)نے ظلم ،جبر، تشدد، غلبے اور بربریت کا راستہ اختیار کیا تھا۔انھوں نے نوآبادیاتی نظام قائم و مستحکم کیا، ہر مزاحمت کو بری طرح کچل ڈالا، ہر باغی کو سخت سزا دی گئی۔نوآبادیاتی ممالک میں جب آزادی حاصل کرنے اور ملک و قوم کی تنزل کی فکر کے باعث اس کی ترقی و مفاد کا مستحسن سیاسی رویہ سامنے آیا تو اسی میں سے متشدد خیال نے اپنا الگ راستہ اختیار کیا۔پریم چند اپنے افسانوں ’قاتل‘ اور ’قاتل کی ماں‘ دونوں میں سیاسی ردِ عمل کی انتہائی صورت کو پیش کرتے ہیں جو ردِ استعماری رجحان کی انتہائی شکل ہے۔

پریم چند کے افسانوں کی ردِ استعماری جہت حب الوطنی، عدم تعاون اور سودیشی تحریک، متشدد انقلابی تنظیم پر مشتمل افسانوں کے مطالعہ سے واضح کی گئی ہے۔نوآبادیاتی اداروں ،نوآبادیاتی مظالم و اثرات، نوآبادیاتی جاگیرداروں اور نوآبادیاتی سرمایہ داروں کے خلاف مزاحمت اور احتجاج بھی ردِ استعماریت کے باب میں شامل ہے۔ پریم چند جبری، استحصالی اور استبدادی نظام کے خلاف تھے، وہ ایسا نظام چاہتے تھے جو معاشی توازن رکھتا ہے اس لیے نوآبادیاتی نظام کے برے اثرات اور اس سے نجات پانے کی کوشش اپنی تحریروں کے ذریعے کرتے ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

1۔پریم چند، سوزِ وطن، الہ آباد: تہذیب پبلی کیشنز، ۱۹۸۰ء، ص ۲۸۔۲۹

2۔ عظیم الشان صدیقی، افسانہ نگار پریم چند تنقیدی و سماجی محاکمہ، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۶ء، ص ۲۲

3۔پریم چند، سوزِ وطن، ص ۵۵

4۔ایضاً، ص ۵۹

5۔ ایضاً، ص ۶۴

6۔ پریم چند، کلیاتِ پریم چند، (جلد ۱۰)، مرتب: مدن گوپال، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، ۲۰۰۱ء، ص ۴۹۱

7۔ پریم چند، کلیاتِ پریم چند، (جلد ۱۰)، ص ۴۹۲

8۔ ایضاً، ص ۴۹۲

9۔ ایضاً، ص ۴۷۳

10۔ عظیم الشان صدیقی، افسانہ نگار پریم چند تنقیدی و سماجی محاکمہ، ص ۳۱

11۔ پریم چند، کلیاتِ پریم چند (جلد ۱۳)، مرتب: مدن گوپال، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، ۲۰۰۳ء، ص ۱۳۳

12۔ پریم چند، کلیاتِ پریم چند (جلد ۱۳)، ص ۱۳۴

13۔ ایضاً، ص ۱۱۱

14۔ ایضاً، ص ۱۱۴۔۱۱۵

15۔ ایضاً، ص ۱۱۵

16۔ ایضاً، ص ۹۶۔۹۷

17۔ پریم چند، کلیاتِ پریم چند(جلد ۱۴)، مرتب: مدن گوپال، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، ۲۰۰۳، ص ۱۹۷

18۔ پریم چند، کلیاتِ پریم چند، (جلد ۱۴)، ص ۴۳۹۔۴۴۰

References in Roman Script:

1. Prem Chand, Soz e Watan, Ala Abad: Tehzeeb Publications, 1980, P28-29
2. Azeem Ul Shan Siddiqui, Afsan Nigar Prem Chand Tanqeedi o Samaji Mohakma, Delhi: Educational Publishing House, 2006, P 22
3. Prem Chand, Soz e Watan, P55
4. As Above, P59
5. As Above, P64
6. Prem Chand, Kuliyat e Prem Chand (Vol 10), Murrattab: Madan Gopal, New Delhi: Qoumi Concil bray Urdu Zaban, 2001, P491
7. Prem Chand, Kulyat e Prem Chand (Vol 10), P492
8. As Above, P492
9. As Above, P473

10. Azeem Ul Shan Siddiqui, Afsan Nigar Prem Chand, Tanqeedi o Samaji Mohakma, P 31
11. Prem Chand, Kuliyat e Prem Chand (Vol 13), Murrattab: Madan Gopal, New Delhi: Qoumi Concil bray Urdu Zaban, 2003, P123
12. Prem Chand, Kuliyat e Prem Chand (Vol 13), P 134
13. As Above, P111
14. As Above, P114-115
15. As Above, P115
16. As Above, P96-97
17. Prem Chand, Kuliyat e Prem Chand (Vol 14), Murrattab: Madan Gopal, New Delhi: Qoumi Concil bray Urdu Zaban, 2003, P197
18. Prem Chand, Kuliyat e Prem Chand (Vol 14), P439-440